

گنوادان کا سقیدہ مطابعہ

انور کمال حسینی

نشام بک ہاؤس

110025، اسٹریٹ نمبر 6، بلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی 334/H

گنودان کا ستھنی مطالعہ

انور گمال حسینی

ابزار پرکاشنگ ہاؤس

۲۰۶۰ دریا نگہ، نئی دہلی १०००२

پہلا طلب ایڈیشن

باراول — ۱۹۹۵

تعداد — ایک ہزار

قیمت — ۸۱ روپے

مطبع — جواہر آفیسٹ پرسیں دہلی ۲

زیراہتمام — سید عامر حسین

اعجاز پیش نگ ہاؤس

۲۰۶۰ - کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پیش لفظ

ہر ادبی عہد کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے، اس کے اپنے کلیدی الفاظ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر عہد کی ادبی شخصیتیں ہوتی ہیں اور کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی جگہ خود ایک عہد، ایک دور ہوتی ہیں۔ منشی پریم چند ایسی ہی ایک عنطیم ادبی شخصیت تھے۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں اور نادلوں کا موضوع، دیہات، دیہاتی زندگی اور وہاں کے لوگوں کو بنایا۔ اپنے نادلوں میں زندگی کا صحیح مطالعہ، روزمرہ کے واقعات، دیہاتی زندگی کا سچا عکس، اپنے سادہ مگر شگفتہ اور روایا اسلوب میں پیش کر دیا ہے۔ اسی سچائی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے پریم چند کا ادبی مرتبہ آج بھی منفرد ہے۔!

گوئدان پریم چند کا آخری نادل ہے جو اردو کاشاہ کار ہے، جسے پریم چند کی انسان دوستی، سماجی درد، حقیقت شناسی اور اس کے انہار نے لازوال کر دیا ہے۔ گوئدان کا تنقیدی مطالعہ صرف گوئدان کی پرکھ کے لیے نہیں بلکہ پریم چند کے مطالعہ کے لیے یقیناً ایک کار آمد مضمون ہے۔ اسی لیے اس کی اشاعت بطور خاص طلبہ کے لیے کی جا رہی ہے۔ اردو ادب کے طلبہ کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر ان کے لیے مفید مطلب کتابیں اور کتابچے شائع کرنے کا یہ سلسلہ یقیناً پسند کیا جائے گا۔

اور کمال حسینی

۱۵ جولائی ۱۹۸۶ء

بی ٹو / چوبیس بی، لارس روڈ،

نسی دہلی ۳۵

اُردو ناول کے بائے میں سوچتے ہی جن ناول نگاروں کے نام ذہن میں سمجھتے ہیں، ان میں پریم چند کا نام پیش ہوتا ہے، پریم چند اُردو کے منفرد ادیب ہیں جن کے افاؤں اور ناولوں میں جیتنے جا گئے تک دار اور جانی پہچانی زندگی ملتی ہے، وہ زندگی کے حسن کو بھی دیکھتے ہیں اور اس کی بد صورتی کو بھی۔ لیکن وہ بد صورتی سے نفرت نہیں کرتے بلکہ بد صورتی کو خوب صورت اور پاکیزہ بنانے کی خواہش کرتے ہیں۔

اگرچہ اُردو میں ناول نگاری کی ابتداء پریم چند سے پہلے نذرِ احمد کو بھائیتے یہیں نذرِ احمد کے ناول فِن ناول نگاری کے سعادت سے مکمل ناول نہیں کہے جاسکتے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے ناول بھی روزمرہ کی زندگی کے واقعات سے پر ہیں، لیکن محض پنڈ نصائر کی پوٹ ہیں۔ نذرِ احمد کے پیشِ نظر اصلاحِ معاشرت اور تعلیم نساں ہے، اور ان ہی بیانوں پر انہوں نے ناولوں کی عمارتیں کھڑی کیں۔

نذرِ احمد کے بعد دوسرا ہم نام ترن ناٹھ مر شار کا ہے، فناہ آزاد، اُردو میں ابتدائی ناول کا عمدہ نمونہ ہے۔ لکھنؤ کی مشتی ہوئی تہذیب اور گری ہوئی حالت کی سچی تصویریں اس میں پیش کی گئی ہیں، خوجی کا کرد اداز اپنے اس زمانے کی سماجی اور اخلاقی

حالت کی اچھی نمائندگی کرتا ہے۔

مولانا عبد الحليم شردار اردو کے پہلے نادل بھائیں جنہوں نے انگریزی اصول پر نادل لکھئے، لیکن تاریخی نادلوں میں آپ اکثر دبیشتر جذبات میں بہہ گئے ہیں جس کی وجہ سے سچائی کا دامن کہیں کہیں راستہ سے چھوٹ گیا ہے اور معاشرتی نادلوں کے گزہ اور کٹھپلیوں کی صفحہ مصنف کے اشاروں پر چلتے اور واقعات کی رو میں بہتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان میں زندگی کے آثار اور حقیقت کا وہ رنگ پیدا نہیں ہوتا جو فارسی کے دل پر نقش ہو جائے۔

مولانا شریعتک اردو نادل کافی ترقی کر چکا تھا اور یہ صرف حیرت انگریز دا قعات اور تفریح طبع تک ہی محدود نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس میں زندگی کے روزمرہ کے واقعات بھی پیش کیے جانے لگے تھے۔ گویا نادل میں حقیقت بگاری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ مرزا محمد ہادی رسموا کا نادل امراؤ جان آدا، اس سلسلے کی پہلی مگر بہت کامیاب کڑی ہے امراؤ جان آدا ایک طوائف کی داستانِ زندگی ہے، جسے بڑی فنکاری اور چاہکدستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ رسموانے اپنے نادلوں کے باکے میں خود کہا ہے:

”ہمارے نادل نہ ریجڈی ہیں نہ کامیڈی۔ نہ ہمارے ہیر و ٹموار سے قتل ہوتے ہیں، نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی ہے۔ نہ ہجر ہوا ہے نہ دصل۔ ہمارے نادلوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔“

اس میں شک نہیں کہ رسموا کے نادل اپنے زمانے کی تاریخ ہیں۔ انہوں نے اپنے نادلوں میں لکھنؤ، اس کے حالات و ماحول اور لوگوں کی اخلاقی اور سماجی حالت کی بہترین حکایتی کی ہے۔

اُردو ناول میں حقیقت نگاری کی ابتداء ہو چکی تھی۔ پریم چند اس سلسلے کی دہ کڑی ہیں جس نے اس عروج پر پہنچایا۔ انھوں نے پلاٹ اپنے زمانے کے ماحول اور واقعات سے لیے اور کردار عام لوگوں سے۔ اور جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، اسے جیوں کا تینوں صفحہ قرطاس پر پچھیر دیا۔ بقول رشید احمد صدیقی "اُردو ادب میں پریم چند سے زیادہ ہندوستانی کوئی اور ہندوستانی ناول نگار نظر نہیں آتا ہے" پریم چند نے اگرچہ اپنے ناولوں میں شہری اور دیہاتی روؤں سے زندگی کی عکاسی کی ہے لیکن جتنے کامیاب وہ دیہاتی زندگی پیش کرنے میں میں، اتنے شہری زندگی میں نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ یو۔ پی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ ان کی عام گھر میوزندگی بھی عام مگاونوں کی زندگی کی ہی طرح تھی جس طرح کسان تنگ دستی میں محنت مشقت سے زندگی گزارتے تھے، ویسا ہی معیار پریم چند کی زندگی کا بھی تھا۔ پریم چند کی زندگی مکمل طور سے دیہاتی زندگی تھی، جس میں گاؤں کی گرد آلو گندی گلیوں، ٹوٹے چھوٹے مکانات، کسانوں کی کچلی ہوئی زندگی اور قدیم رسم و رواج کے تذکرے کے ساتھ ساتھ آموں کے ہرے بھرے باغات، لمبھاتے ہوئے کھیت اور سبک روی سے بہتی ہوئی زندگی بھی تھی۔ پریم چند نے فطرت کی اس آغوش میں جو تاثرات قبول کیے، وہ آخر تک ان کی شخصیت پر چھائے رہے۔ پریم چند چونکہ کسان کی تباہ حال زندگی سے مکمل طور پر واقع تھے، اسی لیے انھوں نے کسان کو ہی اپنا مرضی بنا دیا۔ اس کے حالات اور ضرورتیں پیش کیں، کسان کے بدلتے ہوئے ذہن کی بہترین عکاسی کی، اور کسان کی بہتر زندگی کے لیے شرطے بھی دیے، پریم چند کے ہز ناول میں ایک کردار ایسا ہوتا ہے جو ان کے آدراش

کی نمائندگی کرتا ہے۔ پر یہم چند نے اپنے ادب کی بنیادیں، حقیقت بگاری پر قائم کی میں مگر ان کی یہ حقیقت بگاری دیہات اور کسان تک ہی محدود ہے، کیونکہ جب بھی وہ شہری زندگی پیش کرتے ہیں تو حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ جتنے قریب دیہاتی زندگی میں کسان کے رہے ہیں، اتنے شہری زندگی کے نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دیہاتی زندگی میں وہ اپنی نمائندگی کرتے ہیں اور شہری زندگی میں دوسروں کی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جگہ میتی سے آپ بیتی، کہیں زیادہ دچکپ اور متاثر کن ہوتی ہے۔ پر یہم چند نے اپنے ادب کا موضوع گاؤں اور کسان کو بنایا اور آخر تک یہی ان کافن اور مقصد زندگی رہا۔ انہوں نے اپنی ذات اور ادب میں گاؤں اور گاؤں والوں کو پیش کیا ہے، ان کے روزمرہ کے حالات پیش کیے ہیں، ان کی ضرورتیں بتائی ہیں، ان کے مصائب اور سکالیف کا ذکر کیا ہے۔ زمیں داروں کی پالیسی اور جور و ظلم کو ظاہر کیا ہے۔ پر یہم چند دراصل گاؤں کی زندگی کے نمائندہ اور عمار ہیں، ان کے ادب میں علمی اور زدرو ظلم کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے مادی اور روحانی پہلوکی سمجھی اور حقیقی تصور یہ ملتی ہے۔ بغاوت کرتے ہوئے کسان جزو میں داروں اور ساموکاروں کی علمی سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی مکاری جو ہندوستانی عوام کی مذہبی انتہا پسندی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رشتہ حردی، دھوکہ بازی، توہم پستی اور روایت پستی، روزمرہ کی زندگی کے یہ وہ موضوعات ہیں جن کے گرد پر یہم چند نے اپنے ادب کا تانا بانا بنا ہے اور پر یہم چند کی عظمت کا راز بھی یہی ہے کہ انہوں نے بڑی سچائی اور شدت کے ساتھ کسانوں کی ذہنی حالت،

اور متوسط طبقے کے نقطہ نظر کو اس وقت پیش کیا، جب ہندوستان میں اہم اور بنیادی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ بريطانوی اقتدار کے خلاف قومی جدوجہد جاری تھی۔ پرانی رسم و رعایات ختم ہوئی تھیں، کافی کی زندگی کے پرانے ڈھانچے ٹوٹ رہے تھے، کافی دلوں میں ظلم و تشدد کے خلاف آداز اٹھانے کا ایک جذبہ پیدا ہوا تھا، ان میں اپنے حقوق کی حفاظت کا بھی جذبہ پیدا ہوا تھا، اگرچہ پریم چندر نے شمالی ہندوستان کی ہی زندگی کو پیش کیا ہے، لیکن ان کی نظر میں اتنی گہرائی اور بیان میں اتنی سچائی ہے کہ وہ تصویر سارے ہندوستان کی ہی نمائندگی کرتی ہے۔

گٹوداں، ایک خالص دیہاتی نادل ہے، جس کے کردار ہوری اور دھنیاشمالی ہندوستان کے بدحال کسان مرد اور عورت ہیں، لیکن ان میں سارے ہندوستان کے کسان اپنی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ انسانیت دوستی پریم چند کے ادب کی جان ہے اس لیے ان کے ہاں کچھ ہوئے انسان بھی بہترین انسان بننے کے خواہش مند ہیں اور یہ خواہش خود پریم چند میں اتنی شدید ہے کہ وہ بعض اوقات بُرے کرداروں کو قلب ماہیت کے ذریعہ اچھا بنایتے ہیں۔ گاندھی ازم بھی ان کے نادلوں میں شدت سے نایاب ہے اور پرده مجاهد تک وہ پوری شدت سے گاندھی ازم کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں لیکن جس طرح زلزلہ پکے اور پنجہ مکافیوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے، اسی طرح زندگی کی تلغی اور ٹھوس حقیقوں نے، واقعات کے جھٹکوں نے ان کے گاندھی ازم میں دراڑیں ہیں شکاف ڈال دیے تھے، اس درخت کی شاخیں مر جا کر گردھکی تھیں، صرف جڑ باقی تھی، لیکن گٹوداں میں وہ بھی ٹوٹی اور سوکھتی نظر آتی ہے کیونکہ ہر دی کان جس زمین پر جان دیتا ہے اور مفلس ہوتے ہوئے بھی سرمایہ دار طبقہ

کی روایات سے پڑا ہوا ہے۔ آخوا سے کھو کر مزدور بننے پر محروم ہو جاتا ہے۔ کسان کو مزدور بنتے دکھانا گاہ میں ازم کے فلسفہ کی شکست ہے۔

گنو دان پر یہ چند کا آخری ناول ہے جو انہوں نے میدانِ عمل، کے بعد ۱۹۳۷ء میں لکھا، اس ناول میں حقیقت نگاری درجہ کمال پر ہے۔ اس ناول میں پریم چند کا تدقیقی زادی نظر بدلنا ہوا ہے اور عوامِ دوستی کا ایک نکھرا ہوا طبقاتی شعور نظر آتا ہے اس ناول میں پریم چند قلب ماہیت کے ذریعہ برے کو اچھا نہیں بناتے، بلکہ جو کردار جیسے ہیں، ویسے ہی رہتے ہیں، اس ناول میں وہ کسان کے انقلابی شعور کو سامنے لاتے ہیں، اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ فرد کی اخلاقی تہذیب و تربیت پر بھی زور دیتے ہیں۔ گنو دان جس زمانے کی تصنیف ہے، وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے شباب کا زمانہ ہے۔ جبکہ ہندوستان کی تحریک آزادی برطانوی سامراج سے ٹکر لے رہی تھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں فرنگی حکومت کا جبر و ظلم اپنے پوئے شباب پر تھا، جب سے قوم کی اعصابی قوت ختم ہو چکی تھی، لیکن سب سے بڑی حالت کانوں کی تھی، وہ لگان بندی کے جرم میں حکومت کے معتوب تھے۔ نیں داروں اور ساہو کاروں کا جبر و تشدد تو ان کا مقدار ہی تھا۔ پریم چند نے یہ سب کچھ دیکھا اور شدت سے محوس کیا، اسی لیے گنو دان ان کی تمام تخلیقات سے منفرد ہے۔ اس ناول میں پریم چند، گاہ میں ادا، تصوریت اور مثالیت سے ما یوس ہو کر بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گنو دان کا شہری حصہ قدرے کردار ہے، لیکن اس میں بھی بعض مثالی کردار مل جاتے ہیں لیکن دیہاتی حصہ جو ناول کا موضوع اور جان ہے بے عجب ہے۔ بقول سردار جفری "اس میں کسی کی قلب ماہیت نہیں ہوتی، کوئی دنیا

کوتیاگ کر تیر تھکرنے نہیں جاتا، کوئی زمیندار اپنی زمین کس انوں میں نہیں بانٹتا۔ پر چند نے بڑی سمجھی اور بے رحم حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اور نادل کو ہودی کی موت پر اس طرح ختم کیا ہے کہ ایک سناٹا چھا جاتا ہے!

” دھنیا مشین کی طرح اٹھی۔ آج جو تسلی تبھی تھی، اس کے بیس آنے پیسے لائی اور ہندی کے ٹھنڈی ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے داتا دین سے بولی۔ جہاں گھر میں نہ گائے ہے نہ پکھیا، نہ پسیہ، یہی پیسے ہیں، یہی ان کا گنو دان ہے۔ اور خش کھا کر گر پڑی ۔۔۔“

گنو دان میں پریم چند نے ہندوستانی کسان کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ ہمارے معاشرے اور ادب کے مستقبل کی طرف ایک اہم اشارہ تھا۔ آخر عمر میں ان کے اند بنیادی تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور وہ اس حقیقت تک پہنچ گئے تھے کہ کس ان کی مصیبت کا حل گاندھی داد کے فدیعہ جاگیر دارانہ ماحول میں ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے سماجی تبدیلی ضروری ہے۔ اور اس طرح پریم چند کے ادب میں ایک بنیادی تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ان کے پہلے ناولوں اور کہانیوں کا مرکزی خیال کوئی سماجی یا معاشرتی مسئلہ ہی نہ تھا، لیکن اس کا حل سماجی اور معاشی نہیں ہوا، وہ انقلاب کی سجائے انفرادی اور روحانی سدهار کی طرف چلے گئے ہیں اور اکثر دیشترایسا آ درش دادی طریقہ پیش کیا، جس پر کسی طرح بھی عمل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن گنو دان میں یہ بات نہیں ہے، اس میں وہ انفرادی تبدیلی کے سجائے بنیادی تبدیلی پر زور دیتے ہیں۔

گنو دان بیلارسی گاؤں کے کسان ہودی کی زندگی کی کہانی ہے، دوسرے کردار وہ ہیں جو کسی نہ کسی طرح اس کی زندگی سے متعلق ہیں یا اس پر اثر انماز ہوتے ہیں۔

وہ رائے اگر پاپ نگہ کے گاؤں کا ایک عام کسان ہے، جس کا کنہہ اس کی بیوی دھنیا
ردا کے گوبرد اور دوڑکیوں روپا اور سزا پر شامل ہے۔ چند بیکھ زمین کی پیداوار پر وہ اپنے
کنہے کے ساتھ گزارہ کرتا ہے، اس کے سر پر قرض کا ذبر دست بوجھہ ہے اور سال میں
ایسے دن کم ہی آتے ہیں جب وہ دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی کھاتے ہیں۔
ہوری ایک سیدھا سادہ نیک اور ایماندار آدمی ہے، لیکن اپنی غرض اور ضرورت
کے لیے خوشاد اور مکر فریب سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اپنے دروازے پر ایک
گائے بندھی دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی آہزو ہے۔ وہ بھولا اہسیر کو اس
گائے دوسری شادی کرایے کالا پچ دے کر ایک گائے حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اس کا
بھائی ہیرا، ہوری کی اس خوش قسمتی سے خوش نہیں ہوتا اور موقع پا کر وہ ایک روز
گائے کونہ ہر دے دیتا ہے، اس طرح ہوری کا یہ خواب کہ وہ ساری زندگی اپنے
دروازے پر گائے بندھی دیکھے گا، پورا نہیں ہوتا، گائے لانے ہی کے چکر میں
بھولا اہسیر کی جھنیا سے گوبرد کا تعلق ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اپنے گھر لے آتا ہے
لیکن باپ کے ڈر سے خود شہر سچاگ جاتا ہے۔ اس طرح ہوری زندگی میں کبھی
ختم ہونے والے مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے تہارہ جاتا ہے۔ جھنیا کو گھر میں
رکھنے کے جرم میں برادری اور مذہب کے تھیکیدار اس سے تاو ان لیتے ہیں، نصل
کی ساری پیداوار ان کی نذر ہو جاتی ہے، دوسری طرف بھولا اپنی بے عزتی کا اتفاق
لیتا ہے اور گائے کے بدے میں ہوری کے بیل کھول لے جاتا ہے۔ ہر دی پیسے چیز
کو محتاج ہو جاتا ہے جس سے ایک وقت روٹی ملنا بھی دشوار ہو جاتا ہے اور جب
گور شہر سے کچھ روپیہ جمع کر کے گھرا ہما ہے تو ہوری کی آجر ڈی زندگی میں جیسے بہار

آجاتی ہے لیکن گوبر اب ایک سید ہا سادا گان نہیں بلکہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات
 کا شعور رکھنے والا ایک ہوشیار مزدود ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ گاؤں کے کسانوں کی
 بدحالی اور خستگی روز بروز ٹھہر جا رہی ہے، زمین دار، سرکاری عہدہ دار اس ہمارے
 اور مدد ہبی ٹھیکیدار انھیں بے رحمی سے لوٹ رہے ہیں تو وہ ہمدری کی مخصوصیت اور
 قدامت پسندی پر بھجن لاما اور اسے تنقیہ کر رہے ہیں، لیکن ہر دسی اپنی قدیم وضع
 کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ آخر گوبر جنیا اور اپنے بچے کو لے کر شہر جلا جاتا
 سونا اور روپا آخر جوان ہو گئیں، لیکن ہمودی کے پاس اتنا پیسہ بھی کہاں
 کہ وہ ان کا بیاہ کرے۔ ایکھ کی فصل پر آس لگائے بیٹھا تھا کہ زمیندار نے بقايا
 لگان کی ڈگری کر کے اسے بھی سلام کرایا۔ لیکن بہرحال کسی دکسی طرح ترقی اور
 لے کر اس نے سونا کا بیاہ تو کہ ہبی دیا، لیکن اب وہ قرض کے جاں میں بڑی طرح
 بھنا ہوا ہے مسلسل ناکامیوں اور ٹکستوں میں اس کے حصے پت کر دیے ہیں
 کھیتی کرنے کے لیے بیل نہیں، اس لیے مزدوری کرنے پر مجبور ہوا، تاکہ پیٹ تو بھرا
 جاسکے۔ ساہوكار اس کی تین بیکھر زمین پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن اپنے پرکھوں
 کی اس نشانی کو وہ کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں: ہارے ہوئے راجا
 کی طرح اس نے اپنے آپ کو اس تین بیکھر کھیت کے قلعہ میں بند کر دیا تھا اور اسے
 جان کی طرح بچا رہا تھا، فلکی کیے، بذنام ہوا، مزدوری کی مگر قلعے کو ہاتھ سے
 جانے دیا مگر اب وہ قلعہ بھی ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا تو اسے بچانے کے لیے اس
 نے اپنی بیٹی روپا کو بڑھے رام سیوک کے ہاتھ در سو روپیں میں بیکھر دیا۔ آپ
 ملدا کی نشانی تو پچھلی گئی لیکن ابھی اس کا گائے پالنے کا امران باقی تھا۔ اس کے لیے

وہ دن رات محنت مزدوری کرنے لگا، لیکن ایک تپتی دوپہر کو وہ کے آٹشیں جھونکوں نے اس کے گزور و ناقواں جسم کو چونک دیا اور گھر آتے آتے وہ گائے پانے کا ارمان دل میں یہے ہمیشہ کے یہے رخصت ہو گیا، صرف مت ہی اسے زندگی بھر کے دکھوں، محرومیوں، شکستوں اور ناکامیوں سے نجات دے سکی۔

ڈاکٹر قمر میں کی رائے میں، اس ناول کو الیہ پر ختم کر کے پریم چند نے سماجی حقیقت نگاری کی روایت کو اپنی بہترین صورت میں زندہ کیا ہے۔ گھوڑاں کا خاتمه اس بات کا ثبوت ہے کہ اب کم از کم انھیں سمجھوتہ پر اعتماد نہیں رہا، اس ناول میں وہ کسانوں کی زندگی اور ان کے گوناگون مسائل کو ایک آدش وادی مصلح کی یعنیک سے نہیں بلکہ ایک حقیقت پسند فن کا رکن نظر سے دیکھتے ہیں۔^{۱۷}

گھوڑاں کے ہیر و ہوری کی کہانی فنی اعتبار سے ہر طرح کامل ہے۔ کرداروں اور واقعات کا سلسلہ حالتوں پر بنی ہے اور اس ناول میں پریم چند کے فن کا سب سے بڑا مکال تو یہ ہے کہ وہ عام روشن سے ہٹکر ایک معمولی اور بودھے کسان کو ہیر دنباٹھے ہیں، وہ ایک عام کسان ہے، جس میں قدیم رسم دردایات کا احترام پوری شدت سے موجود ہے، اس میں ہر طرح کی گزوریاں اور برائیاں موجود ہیں اور وہ ایک ایسا شخص ہے جسے قدم قدم پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن گزوریوں اور برائیوں کے ساتھ ساتھ اس میں سچائی اور دیانتداری کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے، وہ بے ایمانی کرنے کی سوچتا ہے، لیکن اپنی فطری سادگی اور دیانتداری کی وجہ سے کرتا نہیں، لیکن ایک عام انسان جو نے کے باوجود وہ بہاری توجہ و پی اور ہمدردی کا مرکز بنایا ہے۔

ہمہ می ایک عام کسان ہے، جس میں کوئی بات بھی خصوصیت کی نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ گئوداں کا ہیرا ہے اور ایسا عظیم کردار ہے جو یقیناً لا فانی ہے۔ کسی بھی کردار کی عملت، خود اس میں ہی ہوتی ہے نہ صرف اس میں کہ فنکار نے کسی ہرمندی سے اسے پیش کیا ہے اور ہوری کا کردار تو اس بحاظ سے بھی عظیم ہے کہ اس میں بنادٹ بالکل نہیں ہے، وہ ایک عام کسان کی زندگی کا سچانہ اُدھر ہے کیونکہ وہ جن سماجی اقدار، محنت و مرتوت اور ایثار کا حامی ہے، انہیں صیبتوں میں بھی نبھاتا ہے۔ اس کے کسی آدرس میں کبھی بھول نہیں پڑتا۔ وہ مر جاتا ہے لیکن اپنی محبوب قدر دل کو نہیں چھوڑتا۔ گو بر طمع دیتا ہے لیکن ہمہ می اپنی ڈگر سے نہیں ہٹتا۔ ہیرا نے اس کی گائے کو زہر دے دیا لیکن وہ اپنے بھائی سے انتقام لینے کی بجائے اسے جیل سے بچانے کے لیے ڈمڈ بھرتا ہے اور ہیرا کے بھاگ جانے کے بعد اس کے بال بھول کو پر درش بھی کرتا ہے اور آخر میں جب ہیرا اس سے آکر معافی مانگ لیتا ہے تو وہ ایک دیوتا کی طرح اسے معاف کر دیتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ زندگی کی ساری تکلیفیں اور مایوسیاں ختم ہو چکی ہیں۔ بلکل پریم چنہ "کون کہتا ہے کہ زندگی کی جدوجہد میں وہ ہمارا ہے؟ یہ خوشی یہ غرور، یہ حوصلہ، کیا ہمارکی علامت ہے؟ ایسی ہی شکستوں میں اس کی فتح ہے۔ اس کے ٹھٹھے ہٹے تھیا ر اس کی فتح کے جھنڈے ہیں۔ اس کا سینہ سچوں اٹھا ہے، اس کے چہرے پر چمک آگئی ہے۔ ہیرا کی ممنونیت میں اس کی زندگی کی ساری کامیابی مجرم ہو چکی ہے" (رگئوداں: ص ۵۹۲) اور اس طرح ہری اس بکچہ کھوئے کے بعد بھی بہت کچھ پا یتا ہے۔ ہیرا کی ممنونیت میں ہی ہوری کی کامیابی اور عملت دونوں ہی ابھر کے

سامنے آ جاتی ہیں۔

ہوری ایک عام کسان ہے لیکن وہ اپنے آپ کو دوسرے کسانوں سے بڑھ کر سمجھتا ہے، اس کا سبب صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمیندار سے زیادہ قریب سمجھتا ہے اور اس قربت کا اسے فرز ہے، اسی میں جب اس کی بیوی و دھنیا سے زمیندار کے پاس جاتے تو وقت نوکتی ہے تو وہ کچھ چڑھ جاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "تجو ہات سمجھتی نہیں، اس میں کیوں ٹانگ اڑاتی ہے؟" یہ اسی ملتے جلتے رہنے کا تو سچل ہے کہ اب تک جان پکھی ہوئی ہے، نہیں تو کہیں پتہ بھی نہیں لگتا، جب دوسروں کے پاؤں تلے اپنی گرد و دبی ہوئی ہے تو ان کو سہلانے ہی میں بھلاں ہے۔ (دص ۵)

جاگیردار ان نظام میں کسانوں کی زندگی میں جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ زمین کی ملکیت کا مسئلہ ہے۔ زمین کی اسی ملکیت کے جذبے کے گرد اس نفیاً کا چکر چلتا رہتا ہے اور کسان کسی کسی طرح اپنی زمین کو اپنی ہی رکھنا چاہتا ہے ہوری کی بھی یہی نفیاً ہے، وہ رائے صاحب کی جی خود ری جو پابندی سے کرتا ہے وہ بھی زمین کی ملکیت ہی کے لیے۔ گوبرجو ہوری کی اس خوشامدگی روشن سے نالاں ہے کہتا ہے۔ "جب ہم سے زمین کا لگان لیا جاتا ہے تو پھر ہمیں رائے صاحب کی خوشامدگری کی کیا ضرورت ہے؟" تو ہوری اس کے جواب میں کہتا ہے، "اسی سلامی کی برکت ہے کہ دروازے پر جبو پرڈی بنائی اور کسی نے کچھ نہ کہا۔ گھور دنے دروانے پر کھونٹا گاڑا تھا، اس پر کارندے نے دور و پے تاوان لے لیا تھا۔ ہم نے کتنی مٹی کھو دی کارندے نے کچھ کہا؟ جو دوسرا کھودے تو بھرا نہ دینا

پڑے۔ اپنے مطلب سے ملامی کرنے جاتا ہے۔ ”

بعقول متاز حسین ”کانوں کی زندگی میں یہ فلامی اور تحریر نفس اسی وجہ سے پیدا ہوئی کہ وہ اپنی زمین کا مالک نہ تھا، اسے بے دخلی کی دھلکی خوشامد اور چاپلو سی سکھاتی اور ندرانہ دینے پر مجھد کرتی۔ ان حالات میں کانوں کو اپنی زمین کو دانت سے پچھانا نظری صرف اس بات سے نہ تھا کہ وہی ان کا ذریعہ معاش تھا، بلکہ اس لیے بھی ایک ایسے زمانے میں جبکہ زمین بالعموم زمین داروں کی تھی کسی کان کا محدودی زمین کا مالک ہونا کسی بڑی نعمت سے کم نہ تھا۔ ہماری کی زندگی کا بڑا کارنامہ اس تین یہیں کھیت کو بچانا تھا جو کہ محدودی تھا۔ پس تو یہ ہے کہ ہماری کی اصلی جدوجہد ہمی تھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اس کھیت کو بچانے کے لیے سب کچھ کیا، حد تولیہ کے اپنی بیٹی روپا کو دوسرو دپوں میں بیچ دالا۔ لیکن کیا یہ اس کی شکست تھی، کیا اسی نے کھیت کی خاطر دھرم کو بیچ دیا تھا؟

” ہماری نے روپے لیے تو اس کا ہاتھ کا نپ رہا تھا، اس کا سر اور پر نہ آٹھ سکا، منہ سے ایک لفظ نہ نکلا، گودلت کے اتحاد سمندر میں گر پڑا ہوا اور گرتا چلا جائی ہو۔ آج تیس سال زندگی سے رہتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا اور ایسا ہوا ہے کہ گویا کے شہر کے پھانک پر کھڑا کر دیا گیا ہے اور جو جاتا ہے وہ اس کے منہ پر تحرک دیتا ہے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ بھائیو! میں رحم کا مستحق ہوں، میں نے نہیں جانا کہ جیسے کی لوکی ہوتی ہے اور ماگم کی برپکھا کیسی ہوتی ہے، اس بدن کو چیز کر دیکھو، اس میں کتنی جان رہ گئی ہے اور کتنی چڑوں سے چدا اور شکر دوں سے کپلا ہوا ہے (وہی)

ہر دنی کی یہ سوچ اس بات کا ثبوت ہے کہ زندگی کی رُداں میں ہار جانے کے باوجود اس میں انسانیت زندہ ہے، اسے احساس ہے کہ وہ ایک فلٹ کام کر رہا ہے اور یہ صرف اس لیے ہے کہ وہ سچا اور حقیقی کردار ہے، اس میں بنادٹ نہیں ہے جس طرح ایک عام سیدھا سادا آدمی کوئی بھی فلٹ کام کرتے وقت احساس مکتری کا شکار ہوتا ہے، اسی طرح ہر دنی بھی ہے۔ اسی لیے ہر دنی ہمارے سامنے صرف ایک فریادی کی حیثیت سے آتا ہے، اس کا کام سماج سدھار نہیں ہے بلکہ سماج کی حالت پیش کرنا ہے اور اعلیٰ طبقہ کے ذمہ دار اور روشن ضمیر افراد میں حق دانصاف کے جذبے کو پیدا کرنا ہے اور ہر دنی اس میں پوری طرح کامیاب ہے۔ دھنیا، ہر دنی کی دفاسوار بیوی ہے، وہ اگرچہ ہر دنی کی روشن سے قطعی غیر مطمئن ہے لیکن پھر بھی ہر طرح ہر دنی کے ساتھ ہے، بے انتہا رحم دل ہے، جب گوبہ جھنیا کو اپنے گھر چھوڑ کر خود شہر بھاگ جاتا ہے تو اس بات کے لیے سماج و مذہب کے تھیکیدار اس سے تادان وصول کرتے ہیں۔ لیکن دھنیا، جھنیا کو اپنی محبت کا سبب سمجھتے ہوئے بھی اسے اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے۔ اسے ہر قسم کا آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ دھنیا کو ہر دنی سے بھی اس قدر محبت ہے کہ وہ آخوندگ اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہتی ہے۔

جب آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے ہر دنی کہتا ہے "سلسلے تک پہنچنے کی نوبت نہ آئے گی، دھنیا! اس کے پہلے ہی چل دیں گے" تو دھنیا ایک دم آزردہ ہو جاتی ہے، کیونکہ ہر دنی کے مایوسانہ الفاظ نے دھنیا کے چٹ کھائے ہوئے دل میں ہپل سکرید اکر دی تھی۔ اپنے تصور میں وہ ہر دنی کو ہر قسم کی بلااؤں سے محفوظ رکھنے کی

کو شش کر رہی تھی، کیونکہ مصیبت کے اسی اتحاد ساگر میں صرف سہاگ ہی دنکا تھا جس کے سہارے وہ اب سے پار کر رہی تھی۔

دھنیا دینوی معاملات میں ہوشیار نہ تھی، اس کا خیال تھا کہ کھیت کیونکہ زمیندار کے ہیں اس لیے وہ لگان تو لے گا، اور جب وہ اپنا لگان لے گا تو خشام کیوں کی جائے اسی بات پر ہوری اور اس میں آئے دن پھر مٹے موٹے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ دھنیا ایک بادنا، پر خلوص اور ایثار کی دلیل ہے جو پریم چند کے بنائے ہوئے معیار پر پوری اترتی ہے، وہ ایک سیدھی سادی کیان عدالت ہے جو اپنے ماحول کے بھی باہر نہیں نکلتی اور آخر تک ایک وفا شعار گھرستن کی طرح ہوری سے نباء کیے جاتی ہے۔ وہ ہوری سے اکثر دبیت اخلاف کرتی ہے، اس سے لڑتی ہے، پیشی ہے لیکن ہوری کی ذرا تکلیف برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ایک ہندوستانی عدالت ہے اور اس کی نمائندگی پوری طرح کرتی ہے۔

ہوری اور دھنیا کا لگا گوب پر ایک لا ابالی فوجان ہے۔ وہ بھی اپنے باپ کی روشن سے خیر مطمئن ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا باپ زمیندار کی خشام کرے اور اسی لیے جب ہوری رائے صاحب کی لفتگو سے متاثر ہو کر اور یہ خیال لے کر بوٹا ہے کہ بڑے لوگ ہم سے زیادہ دکھی ہیں اور جب اپنے اس خیال کا انہار وہ گوب پر کرتا ہے تو گوب پر کہتا ہے "جسے دکھ ہوتا ہے وہ درجنوں موڑ نہیں رکھا، محلوں میں نہیں رہتا، حلوا پوری نہیں کھاتا اور نماچ رنگ میں پھنسا رہتا ہے۔ آرام سے راج کا سکھ بھوگ رہتے ہیں، اس پر دکھی بنتے ہیں۔" (ص ۲۲) اور شہر سے داپ آنے کے بعد تو گوب کا یہ خیال انہائی شدت اختیار کر لیتا ہے۔ شہر کے تجربے میں وہ

یہ بھروسیتا ہے کہ بڑے لوگوں میں بنادٹ ہی بنادٹ ہوتی ہے۔ شہر پہنچ کر اس کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ وہ کسان سے مزدود بن جاتا ہے، آمد فی بڑھ جاتی ہے اور جب وہ شہر سے گاؤں واپس آتا ہے تو اس کے سوچے بلکہ ڈھنگ ہی دوسرا ہوتا ہے، اسے زینداروں اور جاگیر داروں نے ظلم و تحریم کے ساتھ ساتھ ساکھوں کے ظلم کا بھی احساس ہوتا ہے، وہ سیلاب کی طرح بڑھتے والے صد کے خلاف بھی آداز اٹھاتا ہے۔ وہ گاؤں کے ساہو کار پنڈت داتا دین سے کہتا ہے: "بچے اپنی طرح یاد ہے گتم نے بیل کے لیے میں روپے دیتے تھے، اس کے سوچوٹے ادب سو کے دوسروں ہو گئے۔ اس طرح تم لوگوں نے کانوں کو ٹوٹ ٹوٹ کر محمد بنادالا اور آپ ان کی جمیں کے مالک بن بیٹھے" (ص ۳۵۹)

لیکن ہوری جو پرانی قدروں کا حامل ہے، ہر طرح ڈرا ہوا ہے، اپنے خیال میں چال کا پہلو لے کر کہتا ہے: "دصرم نہ چھوڑتا چاہیے بیٹا، اپنی اپنی کرنی اپنے اپنے ساتھ ہے۔ ہم نے جس بیان پر روپے لیے وہ تو دینے ہی پڑیں گے۔ پھر باہمن ٹھہرے، ان کا پیسہ کہیں نہ پہنچے گا" (ص ۳۹۱)

گورہ ہوری کی طرح ڈرا اور سہا ہوا نہیں ہے۔ اس کی روگوں میں جوشیلانخون ہے، اسی لیے وہ کھنڈ مل کی بڑتاں میں بھی بڑے حرم اور حوصلے سے حصہ لیتا ہے اور فزاد میں زخموں سے چور ہو کر مہینوں بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہتا، وہ ایک انقلابی نوجوان ہے اور اس کے کردار میں پریم چند نے محنت کش طبقہ کے انقلابی شور کی نمائندگی کی ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے:

"یہی جی چاہتا ہے کہ لامٹی اٹھاؤں اور پیشہ، داتا دین، جھنگری سب

سالوں کیمار کر گرا دوں۔ اور انہے کے پیٹ سے روپے بکال لوں ॥ (ص ۳۲۲)

جب آخوندی ہندیا کے سامنے رام سیو کے روپوں کے متعلق اپنی غلطی کا احتراں کرتا ہے تو گورکھتا ہے۔ اس میں پاپ کی توکولی بات نہیں ہے ایسی حالت میں تم کہیں کیا سکتے تھے، کہیت نہ بچاتے تو رہتے گہاں؛ جب آدمی کا کوئی بنس تھیں چلتا تو اپنے کو بھاگ ہی پر چھوڑ دیلے ہے۔ یہاں اس کے خیالات میں شذوذ پیدا ہو جاتی ہے۔ زبانے نے دھانڈی کب تک حلیت رہے گی، جسے پیٹ کی روٹی پیش نہیں اس کے لیے آبرو اور مریادہ سب ڈھرنگئے۔ اللوں کی طرح تم نے بھی دوسروں کا گھلا دبایا ہوتا، ان کا روپیہ مارا ہوتا تو تم بھی سچے اس ہوتے۔ تم نے کبھی دھرم کو نہیں چھوڑا یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ تھاری جگہ میں ہوتا تو یا تو جیل میں ہوتا یا پھانسی پا گیا ہوتا۔ بھنے سے یہ کبھی نہ سہا جاتا کہ میں کما کما کر سکا گھر پھر دوں اور آپ اپنے بال بچوں سے ساٹھ منہ میں جالی لگائے بیجا رہوں ॥

گورکھ کا یہ انقلابی شعور بدلتے دور کی پوری طرح نمائندگی کر رکھے۔

پنڈت داتا دین گاؤں کے ساہو کاریں، دھرم کے شیکیدار بھی ہیں، ان کے نزدیک دھرم میں جو مزا ہے وہ کسی میں نہیں۔ ہندی کے گھر جب جھنیا آ جاتی ۶ تو وہ ہوری سے تاوان وصول کرتے ہیں لیکن جب ان کے بیٹے ماتا دین کا دھرم ایک چماری سلیا سے تعلق رکھنے پر بھرثٹ ہو جاتا ہے تو وہ میں سور روپے خرچ کر کے اپنے بیٹے کا دھرم والپس لے لیتے ہیں۔ بظاہر تو وہ ایک مذہبی آدمی ہیں لیکن ان کا کام دھرم کی آڑ میں زیادہ سے زیادہ روپیہ کہانا ہے، اس طرح وہ اپنے کروار میں ہماجنی طبقہ کی بہت ابھی نمائندگی کرتے ہیں۔

رائے ساگر پال نگہ مگر دان کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ زیندار ہیں، قومی تحریک کی وجہے جیل جاتے ہیں۔ اس طرح کسانوں کو اپنا عقیدت مند بنایتے ہیں مگر کسانوں پر ان کا ظلم کم نہیں ہوتا۔ بیگار لیتے ہیں مگر زیادہ تر سختا راوہ کارندوں کے سرالزام آتا ہے۔ اپنی غربی اور غلامی کا ردنا بھی ردتے رہتے ہیں، غرضکے ہر پہلو سے زیندار طبقہ کی دو عملی پالیسی کی ناٹندگی کرتے ہیں۔ خود اپنے بالے میں کہتے ہیں۔

”تم ہیں بڑا آدمی سمجھتے ہو، ہمارے نام بڑے ہیں مگر درشن بچھوٹے بغیر ہوں میں اگر حدا در دشمنی ہے تو سوار تھے کے لیے پیٹ کے لیے۔ ایسی حدا در دشمنی کو میں معافی کے قابل سمجھتا ہوں۔ ہمارے منہ کا لقمه کوئی چھین لے تو اس کے حق میں انگلی ڈال کر نکانا ہمارا دھرم ہو جاتا ہے۔ بڑے آدمیوں کا حدا در دشمنی صرف لطف اٹھانے کے لیے ہے۔ ہم اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ ہمیں مکاری اور کینہ پنہی میں پورا مرزا آتا ہے۔ دنیا سمجھتی ہے ہم بڑے سکھی ہیں، ہمارے پاس علاقے، محل، سواریاں، نوکر چاکر، قرض، بیسوائیں، کیا نہیں ہیں؟ مگر جس کے دل میں طاقت نہیں، خودداری نہیں، وہ اور چاہے کچھ ہو، انسان نہیں ہے۔ جو حاکموں کے لئے چاٹتا ہوا دراپنے ماتحتوں کا خون چستا ہو، اسے میں سکھی نہیں کہتا، وہ تو دنیا کا سب سے بڑا بدنصیب جاندار ہے۔ مفت خردی نے تو ہمیں بے اتحہ پیر کا بنادیا ہے، ہمیں اپنی مردیت پر ذرا بھی بھروسہ نہیں، صرف افسروں کے آگے دم ہلا بلہ کسی طرح انھیں جہریاں رکھنا اور ان کی مدد سے اتنی رعایا یہ رعب جانا ہی ہمارا کام ہے۔ چاپلوسوں کی خوشامد نے ہمیں

اتنا مغروہ اور تنک مراج بنا دیا ہے کہ ہم سے شرافت، عاجزی اور خدمت سب رخصت ہو گئی ہیں۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر سرکار ہمارے علاقے چھین کر ہم اپنی روزی کے لیے محنت کرنا سکھا دے تو ہم پر بڑا احسان ہو یہ تو یقین ہے کہ اب سرکار ہماری حفاظت نہیں کرنے گی، اب ہم سے اس کا کوئی مطلب نہیں نکلا، ظاہر ہے کہ ہمارا طبقہ بہت جلد مٹنے والا ہے۔ اور جب تک پونجھی کی یہ بیڑیاں ہمارے پیروں سے نکلیں گی تو یہ نحوت ہمارے سر پر منڈلاتی رہے گی۔ ہم انسانیت کا وہ درجہ نہ پا سکیں گے جس پر پہنچنا زندگی کا انتہائی مقصد ہے۔" (ص ۲۰-۲۲)

لیکن اس کے ساتھ ہی جب رائے صاحب کو اطلاع ملتی ہے کہ کھانے کے بغیر بیگاروں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے تو رائے صاحب کی تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں اور وہ سب کچھ بھول کر کہتے ہیں۔ " چلو میں ان بدمعاشوں کو ٹھیک کرتا ہوں۔ جب کبھی کھانے کو نہیں دیا گیا تو آج یہ نئی بات کیوں؟ ایک آنہ روز کے حساب سے مزدوری تو ہمیشہ ملتی رہی ہے، اسی مزدوری پر انھیں کام کرنا ہو گا۔ سید ہے کریں یا ٹھیر ہے۔" (ص ۲۳) اور ایسے موقع پر ہوری جیسا سیدھا سادا کسان سوچتا ہے کہ ابھی یہ کسی کسی دھرم کی باتیں کر رہے تھے اور یکا یک اتنے گرم ہو گئے۔

رائے صاحب بلاشبہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ انگریزی سامراج کے بندوقتائی سماج میں بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اس ماحول میں رائے صاحب کا یہ کہنا کہ اب سرکار کا ہم سے کوئی مطلب نہیں نکلا ہے۔ اگر صد فی صد

صحیح نہیں تو بھی اس میں سچائی موجود تھی کیونکہ جیسے جیسے تحریک آزادی کا دباؤ
سرکار پر پڑتا تھا اور وہ کسانوں اور مردوں کو مراعات دینے پر مجبور ہوتی تھی
تو ظاہر ہے کہ اس کا اثر جاگیر دار اور زمیندار طبقہ پر ہی پڑتا تھا۔ رائے صاحب
تحریک آزادی کے سلسلے میں جیل بھی جا چکے تھے لیکن قوم پرست ہوتے ہوئے
بھی حاکموں سے میل جوں قائم رکھتے تھے۔ گٹوداں میں پریم چند نے جملے صاحب
کی دور حی زندگی پیش کی ہے وہ صرف اکیلے رائے صاحب ہی کی نہیں بلکہ
ان کے طبقے کی بھی ہے۔ پریم چند نے رائے صاحب کے کردار میں ایک خاص
طبقاتی شعر کی نمائندگی کی ہے، لیکن یہ زیادہ واضح نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ
ہے کہ وہ رائے صاحب کی اخلاقیات سے مل کر تبہی ہو گیا ہے کیونکہ جہاں
وہ اپنی غلامی اور احساس کمتری کا اظہار ہوئی۔ کے سامنے بڑی بے باکی سے کرتے
ہیں تو اس کے ساتھ ہی عمل میں بیگاروں پر ظلم بھی روایت ہوتے ہیں اور جب اپنے
بیٹے زور پال کی آزادی اور بیٹی میناکشی کی تکلیف سے دوچار ہوتے ہیں، جسے
بُرستی سے ایک عیاش شوہر ملا تھا تو وہ اتنا وکھی ہوتے ہیں کہ رو حانیت کی
طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پریم چند رائے صاحب کو فنظر تاً ایک اخلاقی
انسان ہی بناتے ہیں۔ وہ تو صرف حالات کے شکار تھے، جس طرح کہ ہوری تھا
جس طرح ہوری اپنے ماحصل میں گزور اور بے دست دپاہے، اسی طرح
دائی صاحب بھی محبوب اور ہے بس ہیں۔ ان حالات میں بقول ممتاز حسین منشی
پریم چند ان دونوں ہی پر رحم کھاتے ہیں اور اس طبقے کی طرف روشنی اور عمل کی
تحریک لیے بڑھتے ہیں، جسے درمیانی طبقہ کہیں گے جو کہ سوشن ریفارم اور آزادی

کی جدوجہد کی حمایت کرتا رہا تھا۔ اس طبقے کی بہترین عناصر کی نمائندگی مژہبیت کرتے ہیں جو کہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں اور جن کی تخلیقاً ایک ہزار روپے ماہانہ ہے۔ مژہبیت کی رہنمائی صرف رائے صاحب زمیندار، مژہبی کھانا سرما یہ دار، نئی روشنی کی ڈاکٹر مس مالٹی اور آئینہ میرا بست کردار کی مالکہ مسز کھنا ہی قبول نہیں کرتی ہیں بلکہ مزدوروں کی جماعت کے بھی وہی لیڈر معلوم ہوتے ہیں۔ جب مزدوروں کی یونیورسٹی کے صدر مرا خود شید اور سکریٹری پنڈت اونکارنا تھے ہر طالب کے ہنگامہ میں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں تو یہ مژہبیت کی ہی ہے جو مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کے لیے لڑتے ہیں۔ مہتا پرمیں چند کے پنڈیدہ کردار ہیں۔ وہ جو کچھ اپنے افعال اور خیالات کے ذریعہ پیش کرتے ہیں، وہی کچھ پرمیں چند سماج میں چاہتے ہیں۔ جب مل جانے کے بعد مژہبی کھانا مژہبیت کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

”آپ نہیں جانتے مژہبیت، میں نے اپنے اصولوں کا کتنا خون کیا ہے، کتنی رشوں دی ہیں، کتنی رشوں میں لی ہیں، کسانوں کی ایکجھ تو لئے کے لیے کیسے آدمی۔۔۔ کچھ، کیسے نقلی پانٹ رکھے۔“ (ص ۳۷۹) جواب میں مژہبیت کی نہیں سمجھائے ہوئے کہتے ہیں۔ ”کھنا جی ذرا اسبر سے کام لیجیے۔ آپ سمجھ دا د جو کر دل آتا چھوٹا دل کرتے ہیں۔ دولت سے آدمی کو جو دقار ملتا ہے وہ اس کا دقار نہیں بلکہ اس کی دولت کا دقار ہے۔ آپ مفاسد کر بھی دوستوں کی عقیدت کے سخن رد سکتے ہیں اور دشمنوں کی بھی بلکہ تب کوئی آپ کا دشمن رہے گا بھی نہیں۔“ (ص ۳۸۰)

مژہبیت انی روشنی کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں بھی عورت کی آزادی کے مقابلہ میں،

اسی یہے مسالتی کے مقابلے میں گوبندی دیوی کا زیادہ احترام کرتے ہیں۔ جہتا کے خیال میں "عورت وفا اور ایشارکی مورت ہے جو اپنی بے زبانی اور قربانی سے اپنے کو مٹا کر شوہر کی روح کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ قابل مرد کا ہوتا ہے مگر جان عورت کی ہوتی ہے۔ مرد اپنے کو کیوں نہیں مٹاتا، عورت ہی سے کیوں یہ امید کرتا ہے۔ مرد میں وہ سکت ہی نہیں ہے وہ اپنے کو مٹائے گا تو کچھ نہ رہ جائے گا۔ اس میں جلال کی زیادتی ہے وہ اپنے گھنٹے میں یہ سمجھ کر کہ وہ عقل کا پتلا ہے پیدھا خدا میں جذب ہونے کا تصور کیا کرتا ہے۔ عورت زمین کی طرح صبر و سکون اور برداشت والی ہے۔ مرد میں عورت کے اوصاف آجائیں تو وہ ہہا تما بن جاتا ہے، عورت میں مرد کے گن آجائیں تو وہ بد کار بن جاتی ہے؟" مistr مہتا طلاق کے مخالف ہیں۔ وہ شادی سے پہلے آزاد انتخاب کے تو قائل ہیں لیکن شادی کے بعد طلاق کے نہیں۔ Mistr مہتا کے معیار پر مسالتی سے کہیں برتر مسز کھنا (گوبندی دیوی) ہے، جو وفا اور ایشارہ کی مورت ہے وہ اپنے شوہر کھنا سے اختلاف رکھتی ہے، پھر بھی ان سے الگ نہیں ہوتی وہ Mistr مہتا کے اس فلسفے کی پوری طرح قابل ہے کہ "ظالم ہونے سے منظوم ہونا کہیں بہتر ہے، جب Mistr کھنا یہ کہتے ہیں" دھن کمانے کے لیے اپنے میں فطری جوہر چاہیئے، صرف چالاکی سے دھن نہیں ملتا۔ اس کے لیے بھی تیاگ اور پسیا لازمی ہے، شاید اتنی ریاضت سے خدا بھی مل جائے۔ ہماری ساری جسمانی، روحانی اور عقلی طاقتوں کے توازن کا نام دولت ہے؟" (ص ۲۸۲) تو گوبندی جواب میں کہتی ہے۔ "یہ مانتی ہوں کہ دھن کے لیے تحریڑی پسیا کرنی نہیں پڑتی، مگر پھر بھی جنم نے اسے زندگی میں جتنی اہم چیز سمجھ رکھا ہے، اتنی وہ نہیں ہے۔ دھن کھو کر

اگر ہم اپنی آدمی کو پاسکیں تو یہ کوئی ہبھگا سو و انہیں بے۔

جس طرح مسئلہ مہتا کے نزدیک انسان کی انسانیت سب کچھ ہے۔ اسی طرح گوبندی بھی انسانیت ہے کو اول درجہ دیتی ہے۔ وہ ایک ہندوستانی ہندو خورت ہے، جس کے نزدیک اس کا شوہر ہی حکومان ہوتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی نظام اور بڑا کیوں نہ ہو۔ میر کھنڈ ایونک ایک سرمایہ دار ہیں اس لیے وہ ہر وقت سزا یاد رانہ ذہن ہی سے ہر ایسا کو سوچتے ہیں، اپنے مالی فائدے کے لیے وہ دوستی کا کچھ خیڑا نہیں کرتے، بیوی کیونکہ پرانی اقدام کی مالک ہے، اس لیے اس کی بھی قدر نہیں کرتے لیکن جب مل میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ ایک دم غریب ہو جاتے ہیں تو اس وقت گوبندی ہی صحیح معنوں میں شرکی زندگی ثابت ہوتی ہے، وہ ان کی ہمت بندھاتی ہے، آگے بڑھنے کا عزم پیدا کرتی ہے۔

اگرچہ مل میں آگ لگ جانے پر کھنا کا قلب تبدیل نہیں ہو جاتا اور وہ ایک مذکور آدمی نہیں بن جاتا ہے، لیکن اسے اپنے دھوکے اور بے ایمانیوں کا شدت سے احساس ہوتا ہے، اور اپنے بڑے میوں کا اظہار وہ مسئلہ مہتا کے سامنے کرتا ہے۔ وہ اصل ایک فیضی تجویز ہے جو پریم پنڈ نے بڑی کامیابی کے ساتھ مسئلہ مہتا کھنا کے ساتھ کیا ہے، اگر کوئی آدمی بے ایمانی سے کوئی چیز حاصل کرتا ہے اور وہ چیز اچھے ضائع ہو جاتی ہے تو اس آدمی کو شدت سے اپنی بے ایمانی اور کمزوری کا احساس ہوتا ہے مسئلہ مہتا کو بھی مل میں اچانک آگ لگ جانے کی وجہ سے اپنی بے ایمانیوں کا اساس ہوتا ہے اور وہ مسئلہ مہتا کو اپنا ہمدرد پا کرنا کا اظہار کر دیتے ہیں۔

گئو دان کا ایک کڑدار پنڈت اونکار لامہ بھی ہیں۔ جو ایک اخبار بھلی کے گندم نما

جو فروش قسم کے اپنی ہیں، سرمایہ داروں کے اس لیے مخالف ہیں کیونکہ خود سرمایہ اور نہیں ہیں، دولت کا حصول ان کے لیے آسان نہیں ہے، لیکن بات بنانے کے لیے کہتے ہیں۔ "اگر دولت میری زندگی کا مقصد ہوتی تو آج میں اس حالت میں نہ ہوتا مجھے بھی دھن کمانے کا ڈھنگ معلوم ہے۔ آج چاہوں تو لاکھوں کما سکتا ہوں۔ مگر یہاں تو دولت کو کچھ سمجھا ہی نہیں۔ ادبی خدمت میری زندگی کا مقصد ہے اور رہے گا" (ص ۹۲) اور واقعی پنڈت ادنکار نامதکی یہ بات صحیح ہے کہ انھیں دھن کمانے کا ڈھنگ معلوم ہے کیونکہ جیسے ہی انھیں موقع نہ آئے تو وہ رائے صاحب سے بھی پندرہ سو روپے وصول کرنے سے نہیں چوکتے۔ نام اور پیسہ کمانے کے لیے مرزا خوشید کے ساتھ مل کر مردوار تحریک چلاتے ہیں لیکن جھگڑا ابترے وقت بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ بظاہر سو شلزم کا دم بھرتے ہیں، اپنی قسم کو محنت کرش طبقتہ سے دا بستہ سمجھتے ہیں، وہ سرمایہ داروں کی عیش کوشی کو حقارت سے دیکھتے ہیں لیکن دراصل وہ بھی سرمایہ داروں کی طرح عیش کرتے، موڑوں پر گھومنے اور اعلیٰ سوسائٹی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے خواب دیکھتے ہیں۔ بظاہر وہ اونچی سوسائٹی کی رنگینیوں سے نفرت کرتے ہیں، لیکن دل سے انھیں پسند کرتے ہیں، اسی لیے وہ رائے صاحب جیسے لوگوں کی محفلوں میں شرکیں ہونے سے کبھی گرینہ نہیں کرتے، ایک محفل میں جب آزاد حینہ مالتی انھیں شراب کا جام پیش کرتی ہے تو وہ اسکار نہیں کر پاتے۔ ان کا دل ان سے کہتا ہے۔ "چال چلن ما حل کے تابع ہے، آج تم مغلس ہو، کسی موڑ کو گرد اڑاتے دیکھتے ہو تو ایسا بجھٹتے ہو کہ اسے پھر وہ سے چور چمد کر ڈالو گے، لیکن کیا تمہارے دل میں موڑ کی تنا نہیں ہے؟ ما حل ہی

سب کچبے بقیہ کچھ نہیں۔ زمانہ کتنا بدل گیا ہے وقت کے ساتھ اگر حل ہمیں ملتے تو وہ تمہیں آئی چھپے چھپڑ کر جلا جائے گا۔ اسی حینہ کے نازک ہاتھوں سے اگر زہر بھی ملے تو اسے تبول کنا جائے ہے۔“ وہ بدیشی چیزوں کے بھی دشمن ہیں لیکن پیسے کے لیے ان بدیشی چیزوں کے اشتہارات اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں۔ پنڈت اونکار دراصل وہ نہیں ہیں، جو کچھ وہ نظر آتے ہیں۔ پر یہم چند نے جگہ جگہ ان کا حنا کا کاڑا یا ہے اور ان کی قومی ہمدردی کی اصلاحیت واضح کی ہے۔

جس مرد دور یونین کے پنڈت اونکار نام تھے سکریٹری ہیں، اس کے صدر، مرتضیٰ خدا شید ہیں۔ وہ ایک کھلاڑی طبیعت کے آدمی ہیں اور مرد دور تحریک بھی صرف تفریح کے لیے ہی چلاتے ہیں اگرچہ آخر میں وہ بھی ہمت ہار کر بیٹھ جلتے ہیں لیکن پنڈت اونکار نام تھکی طرح ریا کار، بزدل اور کم ہمت نہیں۔ اگرچہ لڑائی کے سیدان سے بھاگتے نہیں لیکن مردوروں کے مسائل سے بھی ان کی ہمدردی جذبائی اور ہنگامی ہے کیونکہ مرتضیٰ خدا شید ایک اعلیٰ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ایسے رہیں ہیں جو سب کچھ کھو چکنے کے بعد بھی جرتے کی ایک دوکان پر چار پانچ سور و پے روزگی بھری کرتے ہیں۔ مرتضیٰ خدا شید جہاں ایک طرف مردوروں کے ہمدرد ہیں تو دوسری طرف حکمران طبقے سے بھی بنائے رکھتے ہیں۔ موقع ملتا ہے تو حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ دعوییں اڑاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسی دو رخی پالیسی کی وجہ سے انھیں اپنی جدوجہد ہیں ناکامی ہوتی ہے۔

مسماں میں ایک مغرب زدہ لیڈر ڈاکٹر ہے جو آہستہ آہستہ مشریق کے خیالات سے متاثر ہے۔ نہ کوئی دعا رسمیتی ہے اور مہتا کی معتقد بن جائے ہے لیکن پر یہم چند مہتا کے

اس کی شادی نہیں ہونے دیتے، کیونکہ آخر تک وہ ان کے تصورات کی حدت نہیں بن سکتی ہے اور ایسی حالت میں کا اس حورت سے شادی کر لینا جو گوبندی و بیوی جیسی آدراش وادی بیوی سے کتر ہے، پر یہم چند کو منظور نہیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ وہ اس مالٹی کو اس قسم کی فلسفہ بازی پر مجبور کرتے ہیں جس میں دلیش سمجھوتوں کے لیے تنہا رہنا ہی مناسب ہے، لیکن اس کے ساتھ فارسی یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ اس مالٹی کو مسٹر مہتا کے جذبہ رقابت کی جوانیت سے سخت نفرت تھی جو دراصل مسٹر مہتا کے جذبہ ملکیت کا احساس تھا۔ بہر حال بات کچھ بھی ہو، لیکن آخر تک اس مالٹی اس آدراش تک نہیں پہنچ پاتی، جس کی پر یہم چند ایک ہندوستانی حورت سے توقع کرتے ہیں۔

ٹنخا ایک دلال قسم کا آدمی ہے جو ہمیشہ اپنے ہی فائدے کی سوچتا ہے۔ رائے صاحب نے اپنی سوچ میں اس کا صحیح تجزیہ کیا ہے۔ یہ شخص بھی کتنا بڑا امکار ہے اپنی غرض پڑنے پر گھے کو دادا کہنے والا، پر لے سرے کا بے دفا اور بے شرم۔ (ص ۵۲۰) لیکن علی عباس حسینی کے خیال میں ٹنخا پر یہم چند کا ایک عظیم کردار ہے۔ موصوف کے خیال میں کس لئوں اور ان کے لیڈروں کے کردار ہمیشہ رہنے والے چیزوں نہیں ہیں۔ ممکن ہے کچھ ہی دنوں بعد نظام سیاہی بدل جائے اور دیہاتی اور شہری زندگی دوسرے سانچے میں ڈھال دی جائے۔ یہ نہ جانے یہ بات حسینی صاحب نے کیا سوچ کر کی، جبکہ یہ حقیقت ہے کہ ہوری، گنودان کا نہیں بلکہ پر یہم چند کا سب سے زیادہ ممکن کردار ہے اور ٹنخا ایک ایسا کردار ہے جسے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے اور یہ حقیقت ہے اگر گنودان میں ٹنخا کا کردار نہ بھی ہوتا تو اس سے گنودان کی کہانی

پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پنڈت کشن پرشاد کوں بھی کسی حد تک پریم چند کے مخالفت ہیں۔ لیکن گُودان کے یے وہ کہتے ہیں۔ "گُودان کی حیثیت نرالی ہے اور اس کا پایہ اونچا ہے۔ میری نظر سے اب تک کوئی دوسرا ناول اس قسم کا اور اس پایہ کا اُردو میں نہیں گزر رہا۔" اگرچہ بعد میں وہ خود ہی اپنی رائے سے اختلاف بھی کرتے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہو کہ گُودان کی اہمیت ان کے یہے بھی سلم ہے۔

حیثیت مجموعی پریم چند اس ناول میں بہت زیادہ پڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گاندھی واد سے ان کا اعتقاد اُٹھ چکا ہے، دلوں کی تبدیلی سے وہ ما یوس ہیں: میدانِ عمل کے بر عکس یہاں اختتام 'بعافت' نہیں۔ یہاں اس بات کا سمجھ لینا غروری ہے کہ پریم چند اُنقلابی نہیں بنے ہیں، پرانے نظریات اور گاندھی وادتے علیحدگی کے باوجود ان کے ذہن میں انقلاب کا واضح تصور نہیں۔ وہ اب 'ہر دے پر وزن' پر ایمان نہیں رکھتے۔ گُوداں میں کسی نہ میندا ر یا سرمایہ دار کا دل نہیں پسیجتا۔ اس کے باوجود پریم چند یہاں بھی افراد کے ذیلیہ کام نکانا چاہتے ہیں۔ ہتا کے کردار کی تخلیق اور تعمیر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ چند اچھے افراد تراجم سما جی بڑیوں کا خاتمہ کر دیں۔ آخر وقت تک وہ اس کہادت کے قابل ہیں کہ گڑ سے مار سکتے ہو تو زہرست دو۔

گُودان کا پریم چند، میدانِ عمل کے پریم چند سے بہت آئے بڑھ آیا ہے مگر یہاں بھی وہ جاگیر دارانہ دور کا، چند ابدی قدر دل کا حامل ہے۔ گوبندی دیوی کا کردار پریم چند کے انھیں تسویات کا آئینہ دار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام پریم چند کے

نzdیک جاگیر دامانہ نظام سے زیادہ قابلِ خدمت ہے، جبکہ حقیقت میں ایسی بات نہیں۔ اس کے علاوہ شہری زندگی کے معاملہ میں پریم چند کا مطالعہ محدود ہے۔ ویہا تو زندگی کی بہترین حکایتی کے ساتھ ساتھ گٹوداں، میں شہری زندگی کی جو تصور یہ ملتی ہے، وہ بہت صاف نہیں پریم چند کا ذہن پوری طرح اس ماحول سے آٹھا نہیں۔ گٹوداں میں وہ شہری زندگی کی کشمکش کو سمجھنے سے قاصر ہیں، اس لیے وہ شہری زندگی کے چند تصنیع آمیز پہلو و کھانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اور انقلاب کا تصور نہ تو ان کے پچھلے نادلوں میں ہے اور نہ گٹوداں میں۔ مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش کو جب کسی منزل پر پہنچانے سے قاصر ہتے ہیں تو مل کو نذر آتش کر ادیتے ہیں۔ عورت کی آزادی کے بارے میں پر دیسرا ہتا جو فلسفہ کے پروفیسر ہونے کے باوجود عملی آدمی ہیں، ان کے خیالات کی پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح پیشہوری لالہ، جنگر شاہ، دلاری کے کردار بھی اپنے طبقہ کی کامیاب نمائندگی کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فنی تکمیل کے اعتبار سے گٹوداں پریم چند کی سب سے کامیاب تصنیف ہے۔ اگرچہ اس کی تکنیک میں کوئی جدت نہیں، کہانی کہنے کا وہی جانا بوجھا انداز ہے، لیکن اس کے باوصفت یہ پریم چند کی فنی بصیرت کا بہترین مظہر ہے گٹوداں کے لیے ہندی کے ادب کے ایک ناقدر نہ کہا ہے:

”کرداروں میں ججد نہیں اتنا ہے، مالتی کے کردار میں دھیرے دھیرے تبدیلی ہوتی ہے، وہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے لگتی ہے اور خلوصِ دل سے گاؤں کے پتوں اور بچیوں کی خدمت کرتی ہے، ہیرا اپنے فعل پر نادم ہوتا ہے۔ دھنیا بھی گوبر کی مجبورہ بھنیا کو اپنے گھر میں رکھ لیتی ہے، پہلے چاہے اسے بڑا بھلا کہا جو لیکن اس کی حالت

دیکھ کر اس کے خیالات بدل جاتے ہیں۔ ماتا کا جذبہ ذات برادری کے مقابلے میں غائب آ جاتا ہے منشی جی (پریم چند) کا انسانیت پر گہرا اعتقاد ہے، نیچے سے پچ انسان میں بھی وہ انسانیت کی جھلک پاتے ہیں، ان کے کردار گرتے ہیں لیکن سنبل جاتے ہیں۔ گورکافی گریا تھا لیکن جھنیاک خدمت کا اس پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ آتا دین بھی آخر میں سلیا کو اپنالیتا ہے۔“

یہ حقیقت ہے کہ پریم چند نے ہمدری جیسے معمولی کسان کو نادل کا پیر دبنائے اور اس کے کردار کا مکمل نشوونما دکھا کر اردو ادب میں ایک شاہکار اضفافہ کیا۔ اس کا کردار اردو کے عظیم اور فانی کرداروں میں سے ایک ہے۔ وہ صرف اپنے طبقے کے سماجی مسائل کا نمائندہ ہے بلکہ ہم اس کے کردار میں جا گیر دارانہ نظام زندگی میں پر درش پائے ہوئے کسان پوری طرح دیکھ سکتے ہیں۔

گوہان اپنے دور کا ایک نمائندہ نادل ہے جو ہر حاظ سے پریم چند کا ایک شاہکار ہے۔ اور اس بات کا ثبوت کہ بلاشبہ "پریم چند ہمارے ادب کے سرتاجوں میں تھے اور انہوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا۔"

